ڈاکٹر مزمل حسین

عربی میں فنِ بلاغت کی تدوین (عہدِ قدیم).....ایک تحقیقی مطالعہ

"Rhetoric", infact, constitutes the identity of Arabic Literature, This art gradually developed in "Arabic Literature". The authorities divide this art in four different eras. The present 'Thesis' is an attempt to describe the above mentioned eras pertaining to their manner of research and analysis. The works related to this art have been analyzed through a back-ground study of this art since the very beginning and a very precise attempt has been made to understand the importance and usefulness of this art.

فنِ بلاغت ادب کی شناخت ہے۔عربی ادب میں اِس فن نے بتدریج ترقی کی۔ماہرین اس فن کو چار ادوار میں منقسم کرتے ہیں۔زیرِنظر مقالہ انہی ادوار کو تحقیقی وتجزیاتی انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور آغاز ہی سے اس فن میں ہونے والے کام کو ایک.....مطالعہ کے ذریعے دیکھا گیا ہے اور فنِ بلاغت کی اہمیت وافادیت کو نہایت باریک بینی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

مشرقی فنِ بلاغت کی ابتداء عربی زبان سے ہوئی۔اگر یہ کہا جائے کہ عربی زبان کی اصل شناخت بلاغت کے مباحث ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔بلاغت نے عربی زبان میں بتدریج ترقی کی اور اِس فن کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔جس وقت ہم عربی بلاغتی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ مختلف ادوار سے سفر کرتی ہوئی ''مفتاح العلوم'' جیسی معتبر تصنیف تک جا پہنچتی ہے۔یہ ایسی تصنیف ہے جس نے بعد میں فارسی اور فارسی سے اُردو فنِ بلاغت کو متاثر کیا۔عربی میں اِس فن کو مندرجہ ذیل چار ادوار میں منقسم کیا جاتا ہے۔

پہلا دور: اصول تنقید کا خصوصی مطالعہ
دوسرا دور: علم تنقید کا عمومی مطالعہ
تیسرا دور: علم تنقید پر فلسفیانہ بحث اور علم بلاغت کی ترتیب وتنظیم
چوتھا دور: علم بلاغت کی تدوین کا دورِ آخر۔(۱)

ان تمام ادوار میں ''علم البلاغت'' پر خاطر خواہ کام ہوا جس کی ابتدا ابوعبیدہ (م ۲۰۸ھ/۸۲۳ء) کی پہلی تصنیف ''مجاز القرآن'' سے ہوئی۔لیکن ان کا زیادہ تر کام علم بیان سے متعلق تھا۔بقول استاذ احمد حسن زیات:

> ''گمان غالب یہ ہے کہ سب سے پہلے علم بیان پر جس نے کچھ بحث کی وہ ابوعبیدہ ہیں جنھوں نے اپنی کتاب ''مجاز القرآن'' میں آیۂ کریمہ ''طلعہا کانہ رؤس الشیاطین'' اس میں سے پھوٹنے والے شگوفہ کا خول ایسا ہے جیسے ''شیطان کے سر'' کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ یہ اسی قسم کی تشبیہ ہے جیسی امرؤالقیس کے اس شعر میں ہے:

''یقتلنی والمشر فی مضاجعی
ومسنونۃ رزق کا لیاب اغوال

کیا وہ مجھے قتل کر دے گا حالانکہ تیز تلوار میرے پہلو میں لٹکی ہے اور نیلگوں تیز دھار والی جو بھوتوں اور چڑیوں کے نکیلے دانتوں کی طرح ہے۔ یہاں مرئی محسوس شے کو غیر مرئی وغیرہ محسوس شے سے تشبیہ دی گئی ہے۔''(۲)

ابوعبیدہ کے عہد میں علوم بلاغت پر کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔ ان علوم میں ابتدائی تدوین کا کام صرف چھوٹے چھوٹے رسائل تک محدود رہا جس میں کسی بلاغتی مسئلہ پر مختصر اور نا کافی لکھا گیا۔ اور یہ وہ تحریریں ہوتی تھیں جو کسی سوال کرنے والے شخص کو مطمئن کرنے کے لیے رسائل کی شکل میں سامنے آتی تھیں۔ ابوعبیدہ کا بڑا کمال یہی ہے کہ اس نے تشبیہ کے متعلق ایک رسالہ لکھنے کے ساتھ ساتھ علوم بلاغت میں ''علم البیان'' کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس ضمن میں ''مجاز القرآن'' علوم بلاغت کی اولین اور اہم ترین کتاب ہے۔ اس کتاب میں قرآن پاک کے اسلوب بیان اور اس کے ادبی محاسن پر سیرِ حاصل گفتگو کی گئی اور قرآنی اصطلاحات، اشارات اور استعارات کو اس وقت کے مروجہ تنقیدی اصولوں کے مطابق دیکھا اور پرکھا گیا۔ علم بلاغت کی تاریخ میں یہ پہلا دور ہے جس میں ''مجاز القرآن'' کے ساتھ ساتھ ابن قتیبہ (م ۲۷۶ھ/۸۸۹ء) کی کتاب ''مشکل القرآن'' بھی تصنیف ہوئی۔ اس کتاب میں قرآن کی بعض آیات کا فصاحت و بلاغت کے حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔

تاریخ اسلامی میں یہ وہ دور ہے جب اسلامی تہذیب و ثقافت اپنے پورے جوبن پر تھی۔ یہ دور نویں اور دسویں عیسوی کا دور ہے اس دور میں اسلامی علماء اور فضلا ادب و لغت کے میدان میں نئے مباحث چھیڑے ہوئے تھے۔ اس دور میں اعجاز القرآن کے اسرار و رموز جاننے کی کوششیں ہو رہی تھیں اور ساتھ ساتھ عربی زبان کو ایک خاص مقام دلانے کے لیے نئے معیار قائم کیے جا رہے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عربی زبان اب جزیرۃ العرب سے نکل کر غیر عربی بولنے والے لوگوں میں آن پہنچی تھی اور اس اختلاط کی وجہ سے عربی زبان کو اب نئے پیرائے میں دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

اسی دور میں علوم بلاغت کے دوسرے فن ''علم المعانی'' پر بھی کام شروع ہوا۔ اس فن پر بڑا کام کرنے والوں میں جعفر یحی البرمکی، سہل بن ہارون الفارسی اور الجاحظ کے نام نمایاں ہیں۔ خصوصاً الجاحظ نے علم المعانی کے فن پر اپنی دو معروف کتب ''البیان والتبیین'' اور اعجاز القرآن'' تصنیف کی ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ جاحظ کا تعارف اس طرح کراتے ہیں:

''ابوعثمان عمرو بن بحر، البصری، الجاحظ ۱۶۰ھ/۷۷۶ء میں بمقام بصرہ پیدا ہوا، انتقال ۲۵۵ھ میں ہوا۔ مختلف ادبی، لسانی اور دینی مسائل پر لکھنے والا یہ مصنف معتزلی عقیدہ رکھتا تھا اور عقل و منطق کی ہمہ گیر اہمیت کا قائل تھا۔ اس نے کئی موضوعات پر قلم اُٹھایا، مسئلہ امامت پر بہت کچھ لکھا جس کا مقصد یہ تھا کہ بنوعباس کی خلافت کو جائز ثابت کیا جائے۔ بنوعباس کے زمانے میں اسے بغداد میں رہنے کا موقع ملا تو اس نے یونانی علوم سے خاص استفادہ کیا۔ اس کی مشہور تصانیف میں کتاب الحیوان (۷ جلدوں میں) کتاب البیان والتبیین، کتاب العجلاء، کتاب التربیع والقدویر وغیرہ ہیں۔ بہ حیثیت انشاء پرداز اس کا مقام مسلّم ہے۔ لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فن تنقید میں بھی اس کا درجہ بلند ہے بلکہ بعض حیثیتوں سے منفرد ہے۔''(۳)

الجاحظ فن میں بڑا معیار شناس تصور ہوتا ہے۔ اس نے اپنی ''کتاب البیان والتبیین'' میں فن کی تفہیم کے لیے مختلف طریقوں سے بحث کی ہے۔ اس نے اپنے متقدمین مثلاً سہل بن ہارون، العتابی وغیرہ کی آراء کی روشنی میں ادب میں اشارہ، علامت اور استعارہ کے مقام اور کردار کو احسن طریقے سے پیش کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''جاحظ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادب کی غرض، اقناع ترغیب اور تاثر ہے۔ اس کا اصل نصب

العین مقتضائے حال سے کلام کی مطابقت ہے اور اگر اس میں ایجاز کا وصف شامل ہو جائے تو کمال بلاغت کا ظہور ہوتا ہے۔''(۴)

جاحظ کے ساتھ ساتھ اسی دور میں دو اور اہم مصنف بھی قابل ذکر ہیں۔ جن میں ایک الامدی (م ۳۷۱ھ/۹۸۱ء) اور دوسرا القاضی الجرجانی (م ۳۶۶ھ/۹۷۱ء) ہے۔ ان دونوں مصنفین نے نقد شعر اور معروف شعراء کرام کے کلام کے فنی وفکری محاسن کو مدنظر رکھتے ہوئے مطالعے پر زور دیا۔ الامدی نے قبیلہ طیی کے دو اہم شعراء ابوتمام اور البحتری کے کلام کے موازنہ پر ''الموازنۃ بین ابی تمام والبحتری'' نامی کتاب لکھی جبکہ القاضی الجرجانی نے ''الواسطۃ بین المتنبی وخصومہ'' کے عنوان سے کتاب لکھی۔

ان نامور بلاغتی مصنفین کے علاوہ المبرد (م ۲۸۰ھ/۸۹۸ء) کی الکامل، ابن قتیبہ کی الشعر والشعراء، محمد بن سلام الجمعی (م ۲۳۲ھ/۸۴۶ء) کی طبقات الشعراء اور ابوالفرج الاصبہانی (م ۳۵۶ھ/۹۲۷ء کی الاغانی، ایسی کتب ہیں جن میں تنقید شعر کے ساتھ ساتھ علم بلاغت پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں اس کے غالب رجحان پر اس طرح تبصرہ کیا گیا ہے:

''ابتداع وتقلید، انتحال وسرقہ، عبارات ومعانی، اختراع تخلیق ادب، استعداد شعر کے عناصر ترکیبی، ماحول کا اثر اور ایسے ہی دیگر مسائل۔ ان مسائل کی بدولت تزئین کلام سے متعلقہ عام اصطلاحات بھی قائم ہو گئیں۔ مثلاً استعارہ، تشبیہ، تعریض، کنایہ، تجنیس، ایجاز، وضوح وابہام اور ایسی بہت سی اصطلاحات جو بعد میں علم بلاغت کے مقبول عام مباحث قرار پائے۔''(۵)

بلاشبہ اس دور میں فن بلاغت پر یہ سب ابتدائی کوشش تھیں لیکن انہی کوششوں کی وجہ سے آنے والے ادوار میں علوم بلاغت نے شاندار ترقی کی۔ اسی دور میں علوم بلاغت کی تیسری شاخ یعنی بدیع پر پہلا بنیادی اور جامع کام عباسی خلیفہ ابن المعتز (م ۲۹۶ھ/۹۰۸ء) نے کیا۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب ''البدیع'' قابل ذکر ہے۔ اس کتاب میں علم بدیع کے سترہ ابواب پر بحث کی گئی ہے۔ اس عباسی خلیفہ کا ایک ہم عصر قدامہ جعفر مسیحی تھا۔ اس نے اس فن پر ۲۰ ابواب تحریر کیے اور ان میں سات ابواب وہی تھے۔ جن پر عبداللہ بن المعتز نے بحث کی تھی اور تیرہ ابواب نئے تھے اور ان تیرہ ابواب کو ابن المعتز کے ہاں بھیج دیا اس طرح سترہ ابواب ابن المعتز کے اور تیرہ ابواب قدامہ بن جعفر کے مل کر اس فن کے ۳۰ ابواب بنے، پھر ابو ہلال عسکری اور ابن رشیق قیروانی نے بھی اس فن میں مزید ابواب کا اضافہ کیا۔ ابن المعتز کی کتب میں ایک دیوان اور دوسری ''طبقات الشعراء'' ہے۔ لیکن زیادہ شہرت ''البدیع'' کو ملی۔(۶) یہ پہلی کتاب ہے جس میں صنائع ادبی سے بحث کی گئی ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ المعتز کا اپنا بیان ہے کہ وہ علم بدیع کا موجد نہیں بلکہ اس کتاب میں اس فن سے متعلق جو مواد پہلے سے موجود تھا اسے جمع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو مرتب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ المعتز کے عہد میں ناقدین فن جدید شعراء کی تنقیص ادبی صنعتوں کی بنا پر کرتے تھے، المعتز نے یہ موقف اختیار کیا کہ ادبی صنعتیں دراصل عربی ادب کی روایت میں شامل ہیں۔ اگر جدید شعراء ان کا استعمال کرتے ہیں تو وہ غلط نہیں کرتے کیونکہ جن صنعتوں کو ''بدیع'' یعنی ''نیا'' کہا جاتا ہے وہ کلام عرب میں زمانہ قدیم ہی سے بڑے شعراء کے یہاں نیز قرآن مجید اور حدیث نبوی میں بھی موجود ہیں۔ تاہم شعراء کے ہاں اس وجہ سے سقم موجود ہیں کہ وہ صنائع وبدائع کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ اِس کتاب کی اہمیت ایک اور حوالے سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ المعتز نے بعض ادبی صنعتوں کا اضافہ کیا ہے۔ جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ ان اضافوں کے ساتھ ساتھ المعتز نے انواع بدیع کے جمع کرنے میں گہری تحقیق سے کام لیا ہے۔ اِس سلسلے میں ''مختصر المعانی'' میں لکھا ہے:

''امیر المومنین ابوالعباس مرتضی باللہ عبداللہ بن المعتز المتوکل المتوفی ۲۹۶ھ آپ علم ادب کے ماہر اور اونچے

درجہ کے شاعر اور بڑے خوش مذاق عالم ہیں۔علم بلاغت میں آپ نے ایک کتاب ''البدیع''لکھی ہے۔جس کو کسی جرمنی سوسائٹی نے شائع بھی کر دیا ہے۔موصوف کی یہ کتاب صرف اسی وجہ سے قابل قدر نہیں ہے کہ وہ ایک عالی دماغ بادشاہ کی لکھی ہوئی ہے بلکہ اس کی وجہ سے بھی کہ آپ نے انواع بدیع کے جمع کرنے میں کافی عرق ریزی کی ہے۔علامہ الصبان نے نقل کیا ہے''ان اول من اختراع البدیع وسماہ بھذا الاسم عبداللہ المعتز'' خود موصوف نے اپنی کتاب کے آغاز میں ذکر کیا ہے۔''وما جمع قبلی فنون البدیع احد (مجھ سے قبل کسی نے فن بدیع کو جمع نہیں کیا)''۔(۷)

المعتز کے بعد علمائے فن نے اِس علم کا سنجیدگی سے کھوج لگانا شروع کیا حتی کہ ابن حجہ حموی (م ۸۳۷ھ) کی تالیف ''خزانہ الادب'' تک پہنچتے پہنچتے علم بدیع کی صنعتوں کی تعداد ۱۴۲ ہوگئی۔

تاریخ بلاغت کا دوسرا دور علم تنقید کے عمومی مطالعہ کا دور تصور ہوتا ہے۔اس دور میں ادب کے جمالیاتی پہلوؤں پر اجمالی و عمومی نوعیت کے مباحث کا آغاز ہوا۔الجاحظ کی کتاب ''البیان والتبین'' اور ابن المعتز کی کتاب ''البدیع'' اس سلسلے میں پیش رو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کتابوں میں اشارہ، علامت، لفظ، کلام کے محاسن ومعائب، استعارہ، تجنیس، طباق وتضاد، ردالعجز علی الصدر اور لف ونشر کی وضاحت کی گئی۔(۸) تاریخ بلاغت کا یہ دور دراصل پہلے دور کی توسیع ہے۔اس دور میں پہلی مرتبہ یونانی کتب کا ترجمہ کر کے انہیں سمجھنے کی کوشش کی گئی۔اِسی وجہ سے ایک عام خیال رہا ہے کہ دوسرے علوم کی طرح بلاغت کا علم بھی یونان سے آیا ہے۔علم بلاغت کے مباحث، جن کا تعلق تاریخ بلاغت کے ابتدائی دور سے ہے۔یقیناً اس میں یہ خیال صحیح نہیں کہ مسلمانوں نے اس علم کے سلسلے میں یونانیوں کی خوشہ چینی کی ہے۔البتہ علم بلاغت کی تاریخ کے بعد کے ادوار میں مسلم علماء نے یونانیوں کے علم سے ضرور استفادہ کیا ہوگا۔اس سلسلے میں مولانا شبلی نعمانی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں:

''مسلمانوں نے جو علوم وفنون خود ایجاد کیے اور جن میں وہ کسی کے مرہون منت نہیں۔ان میں ایک یہ فن بھی ہے۔عام خیال یہ ہے اور خود ہم کو بھی ایک مدت تک یہ گمان تھا کہ یہ فن بھی مسلمانوں نے یونانیوں سے لیا۔ ابن اثیر نے ''مثل السائر'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ یونانیوں نے فن بلاغت پر جو کچھ لکھا ہے اگر چہ اس کا ترجمہ عربی میں ہو چکا ہے۔لیکن مَیں اس سے واقف نہیں اس لیے اِس فن میں مَیں نے جو نکتے اضافہ کیے ہیں ان میں سے کسی کا مَیں مقلد نہیں، بلکہ خود مجتہد ہوں.....ابن اثیر نے گو اپنے آپ کو یونان کی خوشہ چینی کے الزام سے بچایا ہے۔لیکن فحوای عبارت سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ اصل فن یونان ہی سے آیا تھا لیکن اب اس خیال کی غلطی علانیہ ثابت ہوگئی۔اصل یہ ہے کہ ارسطو نے ایک کتاب ''ریطوریتا'' کے نام سے لکھی تھی۔جن کو اُس نے منطق کا ایک حصہ قرار دیا تھا۔''ریطوریتا'' وہی لفظ ہے جس کو انگریزی میں ''ریٹارک'' کہتے ہیں، اردو میں اس لفظ کا ترجمہ خطابت یا فن تقریر ہو سکتا ہے۔یہی کتاب جس کی نسبت لوگوں کو دھوکا ہوا کہ مسلمانوں کا فن بلاغت اسی سے ماخوذ ہے۔اس کتاب کو شیخ بوعلی سینا نے اپنی کتاب ''منطقیات شفا'' میں پورا پورا لے لیا ہے۔یعنی اس کے مطالب اپنے الفاظ میں ادا کر دیئے ہیں۔ابن رشد نے اس کتاب کے اصل ترجمہ کی، جو اصلاح کی تھی۔اس کا بڑا حصہ بیروت میں چھپ گیا یہ ذخیرے ہمارے سامنے ہیں اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا فن بلاغت ارسطو کی کتاب سے چھو بھی نہیں گیا ہے۔ارسطو کی کتاب کا موضوع یہ ہے کہ جب کوئی تقریر کسی موقع پر کی جائے تو امور ذیل قابل لحاظ ہوں گے۔۱۔مضمون تقریر کیا ہے،۲۔مضمون کے مخاطب کون لوگ ہیں،۳۔تقریر کرنے والا کون ہے۔ان مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے تقریر کے مقدمات کسی قسم کے ہونے چاہئیں۔چنانچہ ارسطو نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ واعظ، وکیل، حکیم، فریق

مقدمہ وغیرہ وغیرہ، کی تقریر کے اصول کیا ہیں؟ اور ہر ایک کے طریقہ استدلال کو کس طرح ایک دوسرے سے مختلف ہونا چاہئے۔ اگر چہ اس میں شبہ نہیں کہ ارسطو کی یہ کتاب نہایت دقیق اور لطیف مباحث پر مشتمل ہے اور اگر چہ اس کا بھی سخت افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس کتاب سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھایا لیکن بہر حال مسلمانوں کا فن بلاغت ایک جداگانہ چیز ہے اور اس کے وہ خود موجد ہیں''۔ (۹)

شبلی نعمانی کی رائے دو حوالوں سے وقیع ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عربی زبان میں علم بلاغت کے مسائل یونانی کتب کے تراجم سے پہلے موجود تھے اور دوسری بات یہ ہے کہ عربی زبان کے بلاغتی مسائل یونانی بلاغتی نظریات سے یکسر مختلف ہیں۔ نیز ''ریطوریتا'' میں بلاغت کے بارے میں کوئی خاطر خواہ بحث نہیں کی گئی اِسی لیے ڈاکٹر سید عبداللہ نے ''ریطوریتا'' کے بارے میں سکاٹ جیمز کے حوالے سے کہا ہے کہ ارسطو نے بلاغت کی جو تعریف پیش کی ہے اس کی رو سے یہ علم اتنا وسیع معلوم نہیں ہوتا۔ (۱۰)

سکاٹ جیمز کا یہ بیان ''ریطوریتا'' کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن ''بوطیقا'' میں بہت سے ایسے مباحث شامل ہیں، جن سے ارسطو کے بلاغتی شعور کا پتا چلتا ہے۔ اِس کتاب کا عربی ترجمہ متی بن یونس (م ۳۲۸ھ/۹۳۹۔۹۴۰ھ) نے دسویں صدی عیسوی کے شروع میں کیا۔ اس مشہور زمانہ کتاب کے بائیسویں باب میں زبان و بیان اور طرز ادا پر جو گفتگو کی گئی ہے وہ بڑی حد تک عربی اور عجمی فن بلاغت کی تعریضوں کا احاطہ کرتی ہے۔ ذیل میں ہم ارسطو کے نظریہ بلاغت کو سمجھنے کے لیے ''بوطیقا'' سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:

''زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پامال و عامیانہ ہوئے بغیر قابل فہم ہو۔ سب سے زیادہ قابل فہم زبان و بیان وہ ہے جس میں روزمرہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہوں۔ مگر یہ پامال و عامیانہ ہو جاتی ہے جیسا کہ کلیفون اور سثھینی لس کی شاعری میں ملتی ہے۔ برخلاف اس کے وہ زبان جو غیر مانوس الفاظ و تراکیب استعمال کرتی ہے شان و دبدبہ کی حامل ہو کر عام سطح سے بلند ہو جاتی ہے۔ غیر مانوس الفاظ و تراکیب سے میرا مطلب غیر ملکی الفاظ، استعاروں، تعقید اور اسی قسم کی چیزوں سے ہے جو عام نہیں ہیں۔ لیکن اس طرح کی چیزوں کا استعمال یا تو ظلم ہوگا یا زبان کو معمہ بنا دے گا۔ معمہ اس وقت جب ساری زبان استعاروں سے لدی پھندی ہو اور ظلم اس وقت، جب اس میں کثرت سے غیر ملکی الفاظ درآمد کئے گئے ہوں۔ معمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقائق کو زبان کی ناممکن صورتوں کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ یہ عام الفاظ کے ذریعے سے نہیں کیا جا سکتا لیکن استعاروں کے استعمال سے ہو سکتا ہے۔ اسی طرح غیر مانوس الفاظ کی درآمد ظلم و تشدد کے مترادف ہے۔ کرنا یہ چاہئے کہ ان مختلف عناصر کا امتزاج پیدا کیا جائے کیونکہ ایک عنصر زبان کو پست اور عامیانہ ہونے سے بچائے گا۔ یعنی غیر مانوس، الفاظ، استعارے، صنائع بدائع وغیرہ، جبکہ روزمرہ کے، الفاظ ضروری صفائی پیدا کریں گے..... زبان و بیان کی صفائی اور شان و وقار پیدا کرنے کا سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ تشریحی الفاظ، ایجاز و اختصار والے الفاظ اور الفاظ کی بدلی ہوئی شکلیں استعمال کی جائیں۔ الفاظ کے عامیانہ استعمال سے یوں ہٹ کر زبان عامیانہ نہ رہے گی جبکہ ساتھ ساتھ لفظوں کا عام استعمال صفائی پیدا کرے گا۔ اس قسم کی زبان پر اعتراض اور شاعروں کا مذاق اڑانا، جو اس قسم کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ کوئی اچھی تنقید نہیں ہے۔ یہ بہت مناسب بات ہے کہ ہر صنعت کا مناسب استعمال کیا جائے مگر سب سے اہم بات استعارے کا استعمال ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو کسی سے سیکھی نہیں جا سکتی اور اسی سے فطری صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے کیونکہ استعارے کے استعمال کی قابلیت مماثلتوں کے ادارک سے تعلق رکھتی ہے۔'' (۱۱)

ارسطو کی طرح لونجائنس (۲۱۳۔۲۷۳ء) نے بھی ادب عالیہ کے لیے کچھ عناصر بیان کیے ہیں، جن سے بلاغت کے معیار مقرر کیے جاسکتے ہیں۔ لانجائنس کا خیال ہے کہ کسی بھی ادبی شہ پارے کے لیے مندرجہ ذیل عناصر کا ہونا لازمی ہے:

''عظمت خیال Grandeur of Thought شدید اور قوی جذباتی تاثیر Vigorour and Spirited یا Treatment of passion، صنائع بدائع (لفظی اور معنوی) کا استعمال، پر وقار زبان کا استعمال یا انتخاب الفاظ یعنی مناسب الفاظ کے انتخاب، موزوں اور برمحل استعاروں کا استعمال، موثر اور پرشوکت ترتیب اور ہیئتی ساخت Majesty and Elevation of Structure''(۱۲)

ان تمام عناصر کے لیے وہ جس بات پر زور دیتا ہے، وہ ہے ان کے استعمال میں فطری انداز، مثلاً صنائع بدائع کے استعمال کے حوالے سے وہ کہتا ہے:

"صنائع اس وقت زیادہ موثر ہوں گے جب اس بات کا پتا نہ چلے کہ یہ صنائع ہیں۔"(۱۳)

یعنی بڑے فنکار کا یہ کمال ہے کہ وہ اپنی تخلیقات میں ایسا انداز اختیار کرے کہ وہ کسی شعوری کوشش کا پتا نہ دے بلکہ اُن میں ایک فطری حسن موجود رہے کیونکہ فطری اندازِ بیان اور برجستگی ہی بڑی تخلیق کا امتیاز ہے۔

لانجائنس کے بعد مغرب میں ایک طویل عرصہ تک کوئی ایسا نقاد نہ آیا جس نے شعری تخلیقات میں زبان و بیان کے مسئلہ پر گفتگو کی ہو۔ اس سارے عرصے میں دانتے (DANTE) (۱۲۶۰ء.....۱۳۲۱ء) ایک ایسا شخص ہے جس نے تنقید اور ادب کے بارے میں کچھ اہم باتیں کہی ہیں۔ وہ کہتا ہے:

"زبان کا مسئلہ ہر شاعر کے لئے خواہ اطالوی ہو یا فرانسیسی، یونانی ہو یا انگریز، بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ادب میں ایک مخصوص زبان استعمال ہونی چاہیے اور یہ زبان روزمرہ سے قریب تر ہونی چاہیے۔ لیکن اکھڑ، ناتراشیدہ اور دیہاتی زبان استعمال نہیں کرنی چاہیے وہ کہتا ہے "De Vulgari Eloquio" یعنی گنواروں کی سی زبان سے پرہیز کرو۔"(۱۴)

دانتے (DANTE) کا مقصد یہ ہے کہ ادب ایک لطیف اور ارفع موضوع ہے۔ اس لیے ادبی تخلیقات کے لیے مخصوص زبان کے فرق کو واضح کرنے کے لیے آنے والے ناقدین نے زبان کے مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو مغرب کے تمام ماہرین جن کے ہاں زبان کے استعمال اور اس کے حسنِ ترتیب پر خصوصی توجہ کی گئی ہے۔

Penguin Dictionary میں ''ریطورک'' کی تعریف و تاریخ کے بارے میں یوں لکھا گیا ہے:

RHETORIC (Greek Khetor [Speaker in the assembly])

Rhetoric is the art of using language for persuation in speaking or writing, especially in oratory. The classical theoreticians codified rhetoric vor thoroughly. A knowledge and command of it was regarded as essential. The major text books included Aristotles Rhetoric, Quintilian's institutio-oratoria; Cicero's DE INVENTIONE, DE OPTIMO GENERE ORATORUM and DE ORATORE. Cicero himself was an accomplished rehetorician. So great was the influence of these men (and, later of longinus in the work

ascribed to him, ON THE SUBLIME) that in the middle Ages rehetoric become past of "Triuium" together with logic and grammer.

The rules for oral and writer compostion (these rules altered little from ciceroisday until well on in the 19th C) were divided into. Fine process in a logical order; INVENTION, ARRANGEMENT (Or DISPOSITION), STYLE, MEMORY and DELEVERY (each had a large number of Sub-Divisions).

Invention was the discovery of the relevent material, Arrangement, was the organisation of the material into sound structural form; under "Style" came the consideration of the appropriate manner for the matter and the occasion (e.g. the grand style, the middle and the how or plain); under "Memory" came guidance how to memorize came guidance how to memorize speches; the section denoted to Delivery eloborated the technique for actually making a speech.(۱۵)

(ترجمہ)

بلاغت، تقریر یا تحریر خصوصا خطابت میں زبان کو استعمال کرنے کا فن ہے۔ کلاسیکی نظریہ دانوں نے فن بلاغت کی مکمل تشریح ووضاحت کی ہے اور (اس زمانے میں) اس کے علم اور اس پر دسترس کو لازم خیال کیا جاتا تھا۔

اس فن پر لکھی گئی خاص خاص کتب میں ارسطو کی RHETORIC کوئن ٹی لیٹن کی Institutio Orattoria، سیسرو کی De optimo Genere Oratoria اور De oratore شامل ہیں۔ سیسرو بذات خود فن بلاغت کا مایہ ناز ماہر تھا۔ ان لوگوں اور متاخرین میں لون جائی نس سے منسوب کتاب کا اثر اتنا زیادہ تھا کہ ازمنہ وسطی میں فن بلاغت بھی منطق اور حرف ونحو کے ساتھ ساتھ Triuium (علوم ثلاثہ) کا حصہ بن گیا۔

اس فن کے قوانین کو منطقی ترتیب میں پانچ مرحلوں میں تقسیم کیا گیا۔ ان قوانین میں سیسرو کے وقت سے 19ویں صدی عیسوی تک کوئی تبدیلی نہ آئی یہ مرحلے Style Arrangement, Memory, Invention اور Delivery ہیں۔ Invention، متعلقہ مواد کی دریافت تھی، Arrange- ment کا مطلب اس مواد کی صحیح انداز میں تدوین و ترتیب، Style میں مواد اور موقع کا مناسب انداز میں زیر غور آنا تھا۔ (Style کی اقسام تھیں؛ اعلی ترین سٹائل، اوسط سٹائل اور پست یا سادہ سٹائل) Memory میں تقاریر اور خطبات کو ذہن نشین کرنے کی راہنمائی کی جاتی تھی اور Delivery میں یہ بات بتائی جاتی تھی کہ تقریر کرنی کیسے ہے۔ یعنی تقریر کا اصل طریق کار کیا ہے۔

مشرق میں تاریخ بلاغت کا یہی عہد ہے۔ جس میں مذکورہ بالا مغربی بلاغتی نظریات کا رواج عام ہوا۔ عربوں کے فن تنقید میں یونانی اثر پہلی مرتبہ ظاہر کرنے والا مصنّف قدامتہ بن جعفر ۹۴۸ھ/۳۳۷ء ہے۔ اس نے عربی فن بلاغت پر مغربی بلاغتی نظریات کی روشنی میں کڑی تنقید کی ہے اور عربوں کے قدیم فن بلاغت کو نقد سے تعبیر کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی دو اہم کتب

تاریخ کا حصہ ہیں ان میں ایک ''نقد الشعر'' ہے جبکہ دوسری کا عنوان ''نقد النثر'' ہے۔ان دونوں کتابوں کے عنوانات سے نظر آتا ہے کہ اب عرب ماہرین فن، بلاغت کو ایک نئے دور میں داخل کر رہے ہیں۔ اِس کی بڑی مثال ''نقد الشعر'' از قدامتہ کا وہ دیباچہ ہے جس میں قدامتہ نے واضح کر دیا ہے کہ متقدمین نے شعر کے تنقیدی پہلو کو جو بہت ضروری اور اہم تھا۔نظر انداز کر دیا اور شعر کے غیر ضروری پہلوؤں پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ اِسی لیے قدامتہ نے اپنی مذکورہ کتاب میں بلاغت کے ان مسائل پر اپنی توجہ مرکوز کی جو ان سے قبل نظر انداز ہوتے آ رہے تھے۔مثلاً عروض اور نحو پر زور دیا اور اپنی گفتگو کا محور لفظ و معنی کے باہمی تعلق کو بنایا۔(۱۶)

اسلام کے یہی علماء اور فضلا ہی تھے جنہوں نے یونانی نظریہ دانوں سے فیض حاصل کر کے عربی فصاحت و بلاغت کو نئے موضوعات سے متعارف کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی نعمانی جنہوں نے اپنے مقالات میں ایک جگہ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں کا فن بلاغت ایک جداگانہ چیز ہے اور اس کے وہ خود موجد ہیں اور اہلِ اسلام یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ یونان کے قدیم ادب سے متعارف ہوئے تو ان کے ہاں فن بلاغت میں نئے مباحث کا آغاز ہوا۔ اِس سلسلے میں وہ رقمطراز ہیں :

> ''علمائے اسلام نے جب یہ ثابت کرنا چاہا کہ قرآن مجید بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے تو اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ پہلے بلاغت کے اصول اور قواعد مرتب کر دیئے جائیں۔اس کا اصلی طریقہ یہ تھا کہ خود کلام عرب کا تتبع کیا جاتا اور بلاغت کے جزئیات کا استقصا کر کے اس کے اصول اور ضوابط منضبط کیے جاتے لیکن جس زمانہ میں یہ کوشش کی گئی اِس وقت عجم کے علوم کا اثر مسلمانوں پر غالب آ گیا تھا۔ اس لیے مسلمانوں نے جس طرح اور علوم و فنون، یونان اور فارس سے اخذ کیے، اس فن کے مسائل بھی انہی کی تحقیقات کے موافق مرتب کیے، عجم کے نزدیک بلاغت کے اصلی ارکان تشبیہ اور بدیع ہیں۔اس لیے علمائے اسلام نے بھی انہی چیزوں کو مہتم بالشان قرار دیا حالانکہ اہل عرب کے نزدیک بدیع ایک لغو چیز ہے اور تشبیہ چنداں قابل اعتنا نہیں.....علمائے اسلام نے فنِ شعر اور بلاغت کی بنیاد ارسطو کی کتاب پر قائم کی۔''(۱۷)

شبلی نعمانی اِس بات کی وضاحت میں کہتے ہیں کہ یونان میں جو شاعری تخلیق ہوئی تھی اُس کا بڑا مقصد فقط لطف انگیزی ہوا کرتا تھا اور یہ لطف انگیزی صرف مبالغہ سے ہی پیدا ہو سکتی تھی۔ چونکہ علمائے اسلام نے بعد میں اپنے فن کی بنیاد ارسطو کے اصولوں پر قائم کی تھی، اِس لیے ان کے ہاں ارسطو کے خیالات کا اثر پایا جاتا ہے۔اس لیے وہ کہتے ہیں:

> ''ارسطو نے جھوٹے طلسم باندھنے کو کمالِ شعری قرار دیا تھا۔علمائے اسلام نے بھی یہ اصول قرار دیا کہ احسن الشعر اکذبہ یعنی اچھا شعر وہ ہے کہ جس میں زیادہ جھوٹ ہو۔ارسطو کے نزدیک بلاغت مصوری کا نام ہے۔ اس لیے علمائے اسلام کے نزدیک بھی بلاغت کی اصلی روح تشبیہ و تمثیل ہے۔ کیونکہ تشبیہ بھی درحقیقت ایک قسم کی مصوری ہے چنانچہ عبدالقاہر جرجانی نے ''اسرار البلاغۃ'' میں لکھا ہے کہ بلاغت کے مہماتِ مسائل تشبیہ ہی سے متفرع ہیں۔ایک اور امر کے علمائے اسلام کو خیال دلایا کہ بلاغت اور شاعری میں جھوٹ کو سچ پر ترجیح ہے۔انہوں نے دیکھا کہ استعارہ، تشبیہ سے زیادہ لذیذ اور لطیف ہوتا ہے مثلاً ان دونوں فقروں میں زید شیر کے مشابہ ہے ''زید شیر ہے'' پہلا تشبیہ اور دوسرا استعارہ ہے اور یہی دوسرا فقرہ زیادہ پرزور اور بلیغ ہے اب ان دونوں فقروں کو دیکھا تو نظر آیا کہ پہلا فقرہ، واقعیت کا پہلو رکھتا ہے۔ کیونکہ ایک شخص، دلیری اور بہادری میں شیر کا مشابہ کیا جا سکتا ہے۔لیکن دوسرا فقرہ تمام تر مبالغہ اور جھوٹ ہو۔اس بنا پر یہ رائے قائم ہوئی کہ بلاغت اور شاعری میں جو زور یا لطف پیدا ہوتا ہے وہ مبالغہ اور جھوٹ سے پیدا ہوتا ہے، ان خیالات نے تمام لٹریچر کو مبالغہ اور کذب سے بھر دیا۔''(۱۸)

شبلی نعمانی کا خیال ہے کہ ارسطو کے نظریہ بلاغت کی بنیاد کذب، جھوٹ اور مبالغے پر ہے اور ارسطو کے نزدیک مبالغہ اور کذب کی وجہ یہ ہے کہ انسان جانوروں کے مقابلے میں اپنے اندر محاکات کا مادہ رکھتا ہے اور محاکات کے معنی کسی چیز کی نقل اتارنا یا صورت کھینچنا ہے۔ شبلی نعمانی ارسطو کے اس نظریہ بلاغت کو اسلامی بلاغت کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے اسی لیے رد کرتا ہے کیونکہ اُن کے نزدیک مغربی نظریہ بلاغت کی بنیاد جھوٹ اور مبالغہ پر ہے۔ جبکہ اسلامی نظریہ بلاغت کی بنیاد جمالیاتی قدروں پر ہے۔ اس سلسلے میں وہ مزید کہتے ہیں۔

> ''بلاغت جس چیز کا نام ہے، وہ عقل کی دست و بازو، انسانیت کا عنصر، راستی کی مترجم اور فخر کا تاج ہے وہ اس رتبہ کی چیز ہے کہ ایک پیغمبر اولوالعزم کا معجزہ قرار پائے، اسی کا اثر تھا کہ قرآن مجید کے اعجاز نے اعجاز موسوی کو بے حقیقت کر دیا۔ اعصائے موسوی کا معجزہ یہودیوں یا قبطیوں کو غلامی کی حد سے آگے نہ بڑھا سکا۔ لیکن اعجاز قرآنی نے لوگوں کو حضیض خاک سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا۔ لیکن اگر بلاغت کی وہ حقیقت ہو جو ارسطو نے بیان کی تو، نعوذ باللہ وہ کسی پیغمبر کا معجزہ کیا قرار پا سکتی ہے؟''(۱۹)

یہاں پر آ کر شبلی نعمانی دراصل یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلامی اور مغربی فنون بلاغت الگ الگ ہیں، دونوں کی بنیادیں جدا جدا، اور رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ یونان کے قدیم ادب کے تراجم نے عربی فن بلاغت پر اپنے دوررس اثرات چھوڑے ہیں۔ عربی فن بلاغت کا لب لباب یہ تھا کہ بلاغت ہر وہ ذریعہ ہے کہ جس سے آپ اپنے معنی کو مقبول اور خوب صورت انداز میں (یعنی فصاحت کے ساتھ) سامع تک پہنچائیں اور سامع کے دل میں ایسا نقش بٹھائیں جیسا کہ آپ کے اپنے دل میں ہے۔ لیکن دسویں صدی عیسوی میں جب عربوں کے فن بلاغت پر یونانی اثرات بڑھے تو اب لفظ کی بحث کے ساتھ ساتھ معنی کے مباحث بھی در آئے اور عربی کے قدیم فن بلاغت میں ایک تبدیلی آنا شروع ہوگئی۔ لہذا شبلی نعمانی کا ارسطو کے نظریات پر یہ اعتراض یہاں آ کر باطل ہو جاتا ہے کیونکہ اب عربی بلاغت نے یونانی اثرات کو قبول کر لیا تھا۔

بلاغۃ العرب کی تاریخ کا تیسرا دور گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کا نمائندہ ماہر بلاغت عبدالقاہر الجرجانی (م ۴۷۱ھ/۱۰۷۸ء) ہے۔ عبدالقاھر جرجانی وہ پہلا شخص ہے جس کا کمال یہ ہے کہ اس نے بلاغت کے فن پر پہلے سے موجود مواد کی ترتیب و تہذیب کا بندوبست کیا۔ اس سلسلے میں اس کی دو قابل ستائش کتب ''دلائل الاعجاز'' اور ''اسرار البلاغۃ'' نمایاں ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے بارے میں اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

> ''انھیں کتابوں کی بنا پر عبدالقاھر کو عربوں کے فن بلاغت کا موسس و بانی سمجھا گیا ہے۔ ان دونوں کتابوں کے مجموعی مطالعے سے ادب کے اصولی نظریے اور تنقید کے بنیادی فلسفے کا پتا چلتا ہے۔ ''دلائل الاعجاز'' میں کلام کے ترکیبی پہلو (یعنی نظم) پر بحث کی گئی ہے اور ''اسرار البلاغۃ'' میں فن ادب کے جمالیاتی اور تاثیری پہلو کا تجزیہ کیا گیا ہے اور یہی بلاغت کی جان ہے۔ ''اسرار البلاغۃ'' میں عبدالقاھر نے علم بلاغت کے بنیادی اصول دریافت کرنے کی کوشش کو جاری رکھا اور ان اصولوں کو قانون نفسیات میں تلاش کرنے کی طرف قدم اٹھایا۔ اس نے تجزیہ کیا، جب ہم ایک جمیل ادبی عبارت سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں کیا کیفیت پیدا ہوتی ہے اور کس طور پر اور تجنیس جیسی صنعتیں ہمیں خوش کرتی ہیں؟ ایک خوب صورت استعارہ یا ایک سلیقے سے چنی ہوئی تشبیہ یا تمثیل کس طرح ہم پر اثر کرتی ہے؟ اور کون سی چیز ہمارے ادبی ذوق سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے، البحتری کا سلیس شعر یا ابوتمام کی گہری اور پیچیدہ نظم؟ اور اسکی وجہ کیا ہے؟ اگر ہم ایسے سولات کے لیے اپنی قوتِ ادراک و تاثیر کے جبلی سرچشموں کی طرف رجوع کریں تو ہمیں تحسین ادب کی مضبوط اساس کا پتا چل سکتا ہے۔ تنقیدی فکر کی تجدید کے لیے الجرجانی نے جو کوشش کی ہے اس میں الجرجانی کی طبیعت کے دو

پہلوؤں کا حسین امتزاج نمایاں ہے اور اس کا منطقیانہ ذہن جو تحلیل و ترکیب کے اصول سے خوب واقف ہے اور دوم تحسین ادب اور اس سے حظ اندوزی کا حقیقی ذوق''۔ (۲۰)

اس تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جُرجانی فن سے متعلق ایک وسیع تر مفہوم رکھتا ہے۔ وہ بلاغت کے اس نقطہ نظر سے وابستہ ہے جو بلاغت میں جمالیاتی قدروں کو اہم گردانتا ہے اسی لیے جرجانی تاریخ بلاغت کا وہ اولین معمار قرار پاتا ہے جس نے ادبی تنقید اور نفسیاتی و جمالیاتی مطالعے کے باہمی ربط و تعلق پر زور دیا اور عربی کے جدید فن تنقید میں اپنا ایک معتبر مقام بنا لیا۔ اس نے اپنی تصنیفات میں بلاغت کے مباحث کو واضح کرنے کے لیے بے شمار مثالیں اور شواہد اکٹھے کیے اور بڑی شرح وبسط سے ان فنون کے مسائل کو واضح کرنے کی تگ و دو کی۔ لیکن عبدالقاھر اپنی کوششوں میں ان فنون کی حد بندی نہ کر سکا اور نہ ہی ان فنون کی علیحدہ علیحدہ حیثیت کو متعین کر سکا اور نہ ہی ان فنون کے علیحدہ علیحدہ غرض و غایت کا تعین کر کے ان کے مباحث کے لیے ایک معیار مقرر کر سکا۔ اس نے ان فنون پر صرف فصاحت و بلاغت کے نقطہ نظر سے بحث کی۔ (۲۱) لیکن یہ بحث اپنے معیار اور انداز کے اعتبار سے اتنی وقیع اور جامع تھی کہ عبدالقاھر کو قدیم فن بلاغت اور فلسفہ تنقید میں ایک منفرد حیثیت حاصل ہو گئی۔ بالخصوص اس کی کتاب ''اسرار البلاغۃ'' فن بلاغت میں ایک سنگ میل ثابت ہوئی اور آج بھی بلاغت کے مباحث، مذکورہ کتاب کے ذکر کے بغیر ادھورے تصور ہوتے ہیں۔ جرجانی نے اس کتاب میں فن بلاغت کے جو معیار مقرر کیے ہیں۔ وہ قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہیں۔ کیونکہ جس وقت یہ کتاب تخلیق ہوئی اس وقت علمائے اسلام کے سامنے عرب کے قدیم بلاغتی نظریات کے ساتھ ساتھ مغربی بلاغتی نظریات بھی موجود تھے اس سے جرجانی نے دونوں قسم کے نظریات سے استفادہ کر کے آنے والے ادوار میں اپنے آپ کو ایک پیش رو کی حیثیت سے منوا لیا۔

عبدالقاھر کے عہد میں عربی فن بلاغت اپنے معیار کے اعتبار سے عروج پر تھا تاہم اس کے دور اور اس کے بعد کے دو سو برس تک بہت سے ایسے نامور علمائے فن آئے جنہوں نے اس فن میں گراں قدر اضافے کیے۔ ان میں ابن رشیق القیر وانی (م۴۶۳ھ/۱۰۷۰ء) کی کتاب ''العمدۃ فی صناعۃ الشعر ونقدہ، ابن سنان الخفاجی کی کتاب ''سر الفصاحۃ اور ضیاء الدین ابن الاثیر (م۶۳۷ھ/۱۲۳۹ء) کی کتاب ''المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر'' نے خاص شہرت پائی۔ عربی فن بلاغت میں یہ وہ نامور اور نابغہ روزگار علماء ہیں جنہوں نے بلاغت، ایجاز، بیان، نظم اور صنایع و بدائع پر سیر حاصل بحثیں کیں۔

تاریخ بلاغت کا چوتھا دور تیرھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کا نمایاں نام ابویعقوب یوسف السکا کی (م۶۹۹ھ/۱۲۹۹ء) کا ہے۔ اس عظیم اور معتبر ماہر بلاغت کا اہم کارنامہ ان کی کتاب ''مفتاح العلوم'' ہے۔ السکا کی نے اختصار کے ساتھ بلاغت کی تینوں شاخوں، معانی، بیان اور بدیع کو علیحدہ علیحدہ ترتیب دیا اور واضح کیا کہ علم معانی کی مدد سے ہم اپنے کلام کو مخاطب کے حالات کے تقاضوں کے مطابق بنا سکتے ہیں، علم بیان کے ذریعے ہم مقتضی حال کے مطابق کلام کو مختلف پیرایوں اور انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔ یعنی ایک ہی بات کو کئی پہلوؤں سے بیان کر سکتے ہیں اور علم بدیع کے ذریعے سے ہم مقتضی حال کے مطابق اور واضح انداز میں پیش کیے گئے کلام کو خوب صورت بنا اور نکھار سکتے ہیں اس طرح السکا کی نے تینوں فنون معانی، بیان اور بدیع کو مستقل انداز میں مرتب کر کے ان کے جملہ مباحث کو ایک منطقی شکل دے دی۔ اس کتاب کی یہی جامعیت تھی کہ بعد میں آنے والے علماء فن کے لیے ایک راستہ متعین ہو گیا اور مذکورہ علوم کی ایک واضح اور مستقل تعریف قائم ہو گئی۔ السکا کی کی اس عظیم کاوش کے بارے میں اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں یوں بیان ہوا ہے:

> ''اس دور کا آغاز السکا کی کی کتاب ''مفتاح العلوم'' سے ہوتا ہے۔ ادب کی تین اہم شاخیں جن سے السکا کی نے بحث کی ہے، یہ ہیں۔ ۱۔ علم الصرف، ۲۔ علم النحو، ۳۔ علم المعانی و علم البیان۔ اس تیسرے باب میں السکا کی نے بلاغت کے دو مختلف علوم کی حدود متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلا وہ علم جس میں نظم کلام کی خصوصیات

پر اس حیثیت سے بحث کی جائے کہ کلام اپنے مقتضی الحال کے موافق ہو جائے۔ یہ علم المعانی کہلاتا ہے اور دوسرا وہ علم جس میں الفیاح الدلالۃ کی مختلف طریق پر اس حیثیت سے بحث کی جائے کہ مقصود صحیح طور پر حاصل ہو۔ یہ علم البیان کہلاتا ہے فنون بلاغت کی اس تقسیم سے مصنف نظم کلام اور زور کلام کی باہمی تفریق کو جسے عبدالقاھر نے نمایاں کرنے کی کوشش کی تھی ایک منطقیانہ انداز سے ثابت کر دیا۔ اس تقسیم کے ساتھ السکا کی نے محسنات کلام پر ایک چھوٹی سی فصل بھی شامل کر دی۔ جس نے بعد میں رفتہ رفتہ بلاغت کے تیسرے مستقل فن۔ یعنی علم البدیع کی حیثیت حاصل کر لی:''(۲۲)

''مفتاح العلوم'' کی جامعیت اور اہمیت کا انداز ''تلخیص المفتاح'' سے لگایا جا سکتا ہے۔ ''تلخیص المفتاح'' علامہ قزوینی (المولود ۶۶۶ھ) المتوفی ۷۳۹ھ/۱۳۳۸ء) کی وہ مشہور کتاب ہے۔ جس کی قدر و قیمت ہر دور میں تسلیم کی گئی۔ اس کتاب کے بارے میں ''مختصر المعانی'' میں لکھا ہے:

''القزوینی الشافعی خطیب جامع دمشق ہیں۔ جنہوں نے امامین جلیلین شیخ عبدالقاہر جرجانی اور علامہ ابو یعقوب یوسف سکا کی کے دلکش انداز نگارش و طریق تحریر و تقریر کے مابین جمع کرتے ہوئے مفتاح العلوم کی قسم ثالث کی تلخیص و تخلیص کر کے ایک مختصر کتاب تالیف کی ہے جس کو تلخیص المفتاح سے موسوم کیا ہے''۔ (۲۳)

اس تلخیص کے ذریعے السکا کی کے بلاغتی نظریات کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوئی۔ اسی کتاب کے ذریعے فصاحت اور بلاغت کو الگ الگ خانوں میں رکھ کر ان کی ایک جامع تعریف متعین کی گئی اور بتایا گیا کہ معانی، بیان اور بدیع مختلف فنون ہیں جو تینوں ملکر فصاحت و بلاغت کے معیار مقرر کرتے ہیں۔ اسی تلخیص میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ علم المعانی کا تعلق ترکیب کلام سے ہے۔ علم البیان کی تین اہم اور نمایاں اقسام تشبیہ، استعارہ اور کنایہ ہیں اور علم البدیع کی مشہور صنعتوں میں تضاد، ارصاد، رجوع، لف و نشر، جمع، تفریق، تجرید، مبالغہ، مذہب کلامی، تجنیس، سجع اور موازنہ وغیرہ ہیں۔ (۲۴)

مذکورہ بالا عربی تاریخ بلاغت کے ادوار سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیائے اسلام کی تاریخ میں علماء بلاغت کے مرغوب موضوعات علم معانی، بیان اور بدیع رہے ہیں۔ حتیٰ کہ سرزمین ایران میں آغاز ہی سے شعر و ادب کے معیارات اپنے علوم کے حوالے سے متعین کیے گئے۔ جب ہم تاریخ ادبیات فارسی کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت فارسی کا آغاز ہوا اس وقت ملک میں عربی زبان و ادب کا تعارف کلی طور پر ہو چکا تھا۔ عربی سرکاری و درباری اور علمی ادبی زبان تھی۔ فارسی شعراء کے سامنے عربی شاعری کے نمونے تھے اور وہ انہی کی پیروی کر رہے تھے۔ تنقید میں بھی وہ عربی اصولوں پر سختی سے عمل کر رہے تھے۔ عربوں کی شاعری کا نظام اوزان عروض پر مبنی تھا۔ ایرانی بھی اس کی پابندی کر رہے تھے حالانکہ ایرانیوں کا اپنا نظام اوزان بھی تھا مگر وہ آہستہ آہستہ متروک ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ عروضی اوزان نے لے لی۔ اب عربی انتقادی اصول اور ضابطے فارسی انتقاد میں آ گئے اور یہ وہی اصول ہیں جو ہمیں عربی انتقاد کے تمام ادوار میں نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات/حواشی

۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر اور دیگر، رئیسِ ادارہ تحریر؛ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، جلد چہارم، ص ۳۶ ۷

۲۔ زیات، استاذ احمد حسن، تاریخ ادب عربی، عبدالرحمان طاہر سورتی، مترجم؛ (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۱ء) ص ۴۹۶

۳۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید (لاہور: سنگ میل، ۲۰۰۰) ص ۱۳۱.....۱۳۲

۴۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۵۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر اور دیگر، رئیسِ ادارہ تحریر؛ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، جلد چہارم، ص ۳۷ ۷

۶۔ یہ کتاب ۱۹۳۸ء میں روسی مستشرق پروفیسر اگنائیوس کراچوپسکی نے شائع کی۔ اس پر آغاز میں انگریزی زبان میں مقدمہ لکھا گیا ہے۔ اس مقدمے میں اس کتاب پر اور اس قلمی نسخہ پر بحث کی گئی ہے جس سے یہ کتاب نقل کی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں ابن معتز کے سوانحی حالات بھی رقم ہیں۔

۷۔ حنیف گنگوہی، مولانا محمد، نیل الامانی شرح اردو، ص ۱۱

۸۔ زیات، اُستاذ احمد حسن، تاریخ ادبِ عربی، عبدالرحمٰن طاہر سورتی، مترجم؛ ص۔ ۴۹۔

۹۔ شبلی نعمانی، مقالات شبلی (ادبی) جلد دوم (اعظم گڑھ: در مطبع معارف، ۱۹۵۰ء) ص ۴۔ ۵

۱۰۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، رئیس ادارہ تحریر؛ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد چہارم، ص ۳۷ ۷

۱۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید، ص ۱۲۵

۱۲۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک (اسلام آباد: نیشنل بک فاونڈیشن، ۱۹۹۷ء) ص ۱۱۸۔ ۱۱۹

۱۳۔ بحوالہ، عابد صدیق مغربی تنقید کا مطالعہ، افلاطون سے ایلیٹ تک (لاہور: امجد بک ڈپو، ۱۹۸۲) ص ۳۸

۱۴۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، ص ۱۵۲

۱۵۔ عابد صدیق، مغربی تنقید کا مطالعہ، افلاطون سے ایلیٹ تک، ص ۵۱

۱۶۔ J.A. Cudden, Penguin Dict. of Literary Terms and Literary Theory (London: Penguin Group, 1991) 3rd Edition, Page, 144.

۱۷۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، رئیس ادارہ تحریر؛ اردو دائرہ معارف اسلامیہ, جلد چہارم، ص ۳۷ ۷

۱۸۔ شبلی نعمانی، مقالات شبلی (ادبی) جلد دوم، ص ۴۱-۱ ۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۹۱-۰۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۴

۲۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، رئیس ادارہ تحریر؛ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد چہارم، ص ۳۹ ۷-۳۹ ۷

۲۲۔ خلیل الرحمٰن، البلاغۃ (اسلام آباد: جامعہ العلامہ اقبال المفتوحہ، ۲۰۰۱) ص ۲۱

۲۳۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، رئیس ادارہ تحریر؛ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد چہارم، ص ۴۰ ۷

۲۴۔ حنیف گنگوہی، مولانا محمد، نیل الامانی شرح اردو ص ۱۵